اردو افسانے پر پشتون کلچر کے اثرات کا تجزیاتی مطالعہ

انور علی*

Abstract:

Urdu language known for its beauty and greater accomadation has always assimilated words and expressions of regional languages and cultures in its fold. In some cases, the influence of regional languages and cultures on Urdu has gone so deep that urdu language and literature had to take a leap forward only with their help. Pashto language and the rich culture of pashtun are among them purely on the basis of their contribution to urdu language.

Pashtun culture is so rich and vibrant that it reflects even the finest nuances of life in their fullness. Urdu short stories have depicted the same beauty of pashtun culture in its own unique way. Urdu short stories have not only beautifully presented Pashtun traditions and values typical to them but, at the same time, it has also made successful attempts to highlight the pashtun demeanor, physique, accent, mannerisms,dress and other idiosycrasies specific to Pashtuns in the delineation of these characters. This research paper analyses these aspects of Pashtun characters in Urdu short stories.

من اندازِ قدت را می شناسم:

وہ جو کہا گیا ہے کہ:

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش
من انداز قدت را می شناسم

* شعبہ اُردو، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ جہانزیب کالج، سوات

ترجمہ: (اے محبوب جو لباس بھی تیرا دل کرے پہن لو۔ میں تو تیرے قد و قامت تک کو پہچانتا ہوں)

کسی پشتون سے بات کرنے سے پہلے ہی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ شخص پشتون ہے۔ اردو افسانوں میں جس طرح پشتون لب ولہجہ اور پشتونوں کے عادات واطوار کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح پشتون کرداروں کو متعارف کراتے ہوئے اکثر ان کے حلیے اور خدوخال کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ پشتون عام طور پر سرخ وسفید اور لمبے قد کے وجیہہ صورت والے ہوتے ہیں۔ ان کی مونچھیں بھی اکثر لمبی اور اُوپر کی طرف مُڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ پاؤں میں پشاوری جوتے، واسکٹ پہنے، کندھے پر چادر تہہ کرکے ڈالے ہوئے، ڈھیلی ساخت کی شلوار قمیض اور مخصوص قسم کی پگڑی سر پر اوڑھے اپنے لہجے کی انفرادیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ اکثر ان کے نام بھی دیگر علاقوں کے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اردو افسانوں میں جہاں پشتون ثقافت کے دیگر عناصر کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے وہاں پشتونوں کے وضع قطع اور خدوخال کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں طاہر آفریدی کے افسانہ ''برف پہاڑوں کا آدمی'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''وہ ایک لحیم شحیم مضبوط جسم کا سرخ وسفید جوان تھا۔ اس کی مونچھیں یوں اٹھی ہوئی تھیں جیسے ان پر ابھی ابھی تاؤ دیا ہو۔ اس کے بائیں کاندھے پر تھری ناٹ تھری کی خوبصورت رائفل لٹکی ہوئی تھی اور کمر سے کارتوسوں کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ اصلی زری والے کلاہ پر مشہدی پگڑی اتنی خوبصورتی سے اس نے باندھ رکھی تھی کہ اگر پگڑی باندھنا فن ہوتا تو وہ اس فن کا ماہر سمجھا جاتا۔۔۔۔ اس کے پیروں میں نسواری رنگ کی پشاوری چپل تھی۔''(۱)

افسانہ ''اندھیرے کا بیٹا'' میں بھی دیہاتی پٹھانوں کے رویوں، عادات واطوار، حلیوں، خدوخال، مخصوص لباس اور دیگر لوازمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ افسانے میں ایک پٹھان کا حلیہ ملاحظہ ہو:

> ''سرخ وسفید رنگ، چوڑی بھری ہوئی چھاتی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، پٹھے دار بھورے بال اس کی شخصیت میں بڑی کشش پیدا کرتے تھے۔۔۔۔ کھدر کی قمیض کھدر کی شلوار، جیب میں پٹھانوں کی طرح کنگی، دنداسہ، سرمے دانی، آئینہ اور چاقوں ایک کڑھے ہوئے رومال میں۔''(۲)

اس اقتباس میں ایک دیہاتی پٹھان کے حلیے اور لباس کی بھرپور جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ دنداسہ، سرمہ، چاقو اور کڑھا ہوا رومال اور رومال میں ان سب چیزوں کو لپیٹ کر رکھنا یہ سب چیزیں ایک دیہاتی پٹھان کے پاس ہوتی ہیں جس سے وہ بوقت ضرورت اپنا حلیہ بناتا سنوارتا ہے۔

بانو قدسیہ کے افسانہ ''موم کا پتلا''(۳) میں گل خان کا کردار پیش کرتے ہوئے اس کا حلیہ اور لباس بھی

کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ اپنے خدوخال اورلباس سے ایک پشتون لگ رہاہے۔گل خان کا سرخ وسفید رنگ،سنہرے بال،شلوارقمیض، سر پرسواتی ٹوپی اور جیب میں چھوٹا شیشہ اور کنگھی پشتون کلچر کے آئینہ دار ہیں۔پشتونوں کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ اکثر کوٹ پینٹ کے ساتھ پگڑی بھی باندھتے ہیں اور کبھی کبھارایسا بھی ہوتا ہے کہ شلوارقمیض کے ساتھ ہیٹ پہن لیتے ہیں۔گل خان اگرچہ ایک طرف جج کے ڈرائیور ہونے کے ناطے ہیٹ پہنتا ہے لیکن دوسری طرف اپنے روایتی لباس میں بھی ملبوس ہوتا ہے۔یوں وہ شلوارقمیض اورواسکٹ کے ساتھ ہیٹ پہنتے ہوئے بالکل عجیب لگتا ہے۔

پشتونوں کا اپناروایتی لباس ہے جو ان کے لیے مخصوص ہے اورانہیں دوسری ثقافتوں سے ممیّز کرتا ہے۔ان میں شلوارقمیص کے علاوہ واسکٹ اور پگڑی خصوصاً پکول اورزری کا کلاہ اورشملہ،پشاوری چپل یہ چیزیں پشتونوں کا روایتی لباس سمجھا جاتا ہے۔اردوافسانوں میں پشتون کرداروں کو پیش کرتے ہوئے ان کے اس ثقافتی روپ کوبھی دکھایا گیا ہے۔محمد خالداختر نے افسانہ''کاریز''(۴)میں پشتون وضع قطع کو پیش کرتے ہوئے پشتون کرداروں کے لباس میں پشتونوں کی روایتی کاڑھی ہوئی رنگ دارفیتوں والی واسکٹ کا دوجگہوں پر ذکر کیا ہے۔طاہرآفریدی کے افسانہ''بہانہ''(۵)میں ملک عظیم کا حلیہ بیان کرتے ہوئے اس کی لمبی مونچھوں اوراونچے طرّے والی پگڑی کا ذکر کیا گیا ہے۔افسانہ''پینشن''(٦)میں بھی فریدگل کے کردارکو پیش کرتے ہوئے اس کے سر پر زری والی کلاہ اورشملہ کودکھایا گیا ہے۔سحر یوسف زئی کے افسانہ''وہ جوگاؤں تھا''(۷)میں پشتون بزگوں کو لمبے لمبے سفید کرتے پہنے اورسر پر سفید پگڑیاں باندھے ہوئے دکھایا گیاہے۔ افسانہ'' حوالدار فقیر خان''(۸)میں افسانہ نگار جہاں خان گھڑی کے خوانین و ملکانان کے اختیار، دبدبہ اور دولت کی فراوانی کا ذکر کرتا ہے وہاں ان کے طرۂ ودستار اورلنگی کے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شملے کا بھی ذکر کرتا ہے۔اشراف حسین احمد کے افسانہ''نانی مریم''میں بھی پشتونوں کی جسامت،شکل وصورت،وضع قطع اورلب ولہجہ کی انفرادیت کوپیش کیا گیا ہے۔افسانے میں نانی مریم کی میت پرآنے والوں میں سے ایک شخص کی وضع قطع ملاحظہ ہو:

> ''جس نے ململ کی پگڑی باندھ رکھی تھی اورجس کی سفید نوک دارداڑھی اُس کی پگڑی کے شملہ سے بھی لمبی تھی۔''(۹)

جس طرح کلاہ اورلُنگی پشتون قبائلی علاقوں کا روایتی پہناوا ہے اسی طرح پشتون معاشرے میں سوات اوردیرکی ٹوپیاں بھی کافی مقبول ہیں اور یہاں کی تیارکردہ ٹوپیوں کولوگ بڑے ذوق وشوق سے پہنتے ہیں۔گاؤں کے بڑے بزرگ عموماً ان کا استعمال کرتے ہیں اوراسے عزت کی علامت سمجھتے ہیں۔افسانہ''پیرےُ ڈم''(۱۰)کے مرکزی کردار پیرمحمد خان کوبھی افسانہ نگارنے سر پرسواتی پٹی کی ٹوپی پہنے ہوئے دکھایاہے۔ بڑی پگڑی باندھنا

اور داڑھی میں مہندی لگانا پشتون بزرگوں کی خاص عادات ہیں۔افسانہ''جالے''(۱۱) میں ایک پشتون بزرگ کو اسی حلیہ میں دکھایا گیا ہے۔افسانہ''بونا''(۱۲) میں کتوں کا مقابلہ دیکھنے کے لیے لوگوں کے مابین چند بزرگوں کو بھی دکھایا گیا ہے جنھوں نے پگڑیاں سر پر باندھ رکھی تھیں۔افسانہ''نجب خان''(۱۳) میں انگریزوں کی بارک پر حملہ کرتے وقت نجب خان اور اُس کے ساتھی ہر طرح سے لیس ہوتے ہیں۔حملہ کرتے وقت وہ اپنی گھاس کی چپلیاں کس لیتے ہیں تا کہ دوڑتے وقت پیروں سے نکلنے نہ پائیں۔گھاس کی چپلی قدیم پشتون ثقافت کی یادگار ہے۔

اردو افسانے میں جہاں پشتون مردوں کے خدوخال اور وضع قطع کو پیش کیا گیا ہے وہاں پشتون عورتوں کا روایتی روپ بھی دکھایا گیا ہے۔پشتون عورتیں اپنے بناؤ سنگھار کے لیے مختلف قسم کے زیور پہنتی ہیں۔طاہر آفریدی کے افسانہ'' ٹھنڈک'' (۱۴) میں عورتوں کے مختلف زیورات کا ذکر موجود ہے جن میں چوڑیاں، بندے، نتھ، کیلی، لونگ، کلپ اور جھومر شامل ہیں۔افسانے میں بڑی بوڑھیاں، نانی دادیاں گیر دار لباس کے ساتھ گلے میں چاندی کی ہنسلی ڈالی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔فاروق سرور کے افسانہ''چارگل'' کا نام ہی ایسا رکھا گیا ہے جو پشتون خواتین کا مقبول زیور ہے۔جسے وہ ناک میں پہنتی ہیں۔افسانے کا مرکزی کردار محنت مزدوری کرتا ہے اور کمائی میں سے تھوڑی تھوڑی بچت کر کے اِتنی رقم جمع کر لیتا ہے جس سے اپنی محبوبہ کے لیے چارگل بنالیتا ہے تا کہ اُس کا حسن مزید نکھر آئے:

''آج رات گل کی مہندی میں اس کی محبوبہ چارگل پہنے گی۔''(۱۵)

افسانہ''دف''(۱۶) میں پشتون عورتوں کی مخصوص روایتی ٹوپی کا ذکر کیا گیا ہے۔افسانے میں دادی کے سر پر سنہری دھاگوں کی ٹوپی دکھائی دیتی ہے جسے''رخچِنہ'' کہا جاتا ہے۔یہ ٹوپی اور اس کا نام دونوں پشتون ثقافت کے غماز ہیں۔لمبے لمبے فراک اور گھیر دار شلوار پشتون خواتین کا ثقافتی لباس جانا جاتا ہے۔چونکہ پشتون معاشرے میں پردے اور حیا کا تصّور بنیادی حیثیت کا حامل ہے، اِس لیے پشتون خواتین اپنا لباس ڈھیلا ڈھالا اور لمبا رکھتی ہیں۔''ندی کی پیاس''(۱۷) میں نانبائی کی خیالی محبوبہ اِسی لباس میں ملبوس نظر آتی ہے۔جب وہ اپنے تصّورات میں اُسے خلوت میں دیکھتا ہے تو وہ لمبے فراک میں ملبوس ہوتی ہے اور جب جلوت میں دیکھتا ہے تو کالے برقعے میں چاند سا چہرہ چھپائے ہوتی ہے۔افسانہ''پیاسے خواب'' میں بھی پشتونوں کی جھگیوں میں رہنے والے لوگوں کی ثقافت کو پیش کیا گیا ہے۔جھگیوں کے رہنے والے مرد اور خواتین دونوں گھر سے نکل کر کپڑا بیچتے ہیں لیکن عورتیں پردہ بھی کرتی ہیں اور ان کا لباس بھی روایتی طرز کا ہوتا ہے:

''میں گھاگرا پہنے لمبا سا گھونگھٹ نکالے سارا دن کام میں مصروف رہتی۔''(۱۸)

پشتون معاشرہ میں بزرگ مرد اپنی داڑھی اور سر کے بالوں جبکہ بزرگ خواتین بالخصوص سر کے بالوں

میں مہندی لگاتی ہیں۔ فاروق سرور نے افسانہ ''دف''**(۱۹)** میں غم کی حالت میں بُڑھیا کا خاکہ یوں پیش کیا ہے کہ لباس اور ٹوپی دونوں پرانے تھے۔ اُس کے بال منتشر تھے اور اس پر مہندی بھی نہیں لگی ہوئی تھی۔ پشتون خواتین آرائش کے دیگر لوازمات سمیت اپنے ماتھے، ٹھوڑی اور بعض اوقات گالوں پر سبز تِل بھی بنواتی ہیں۔ جنھیں مرد سراہتے ہیں، ان کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ محبوب کے ایک ''خال'' کے عوض سمرقند و بخارا بھی بخش دیتے ہیں۔ افسانہ ''مجرم'' میں لال کی محبوبہ خواب میں اپنی شادی کا منظر دیکھتی ہے۔ اُس کے گرد خواتین کا حلقہ ہے جن کی ٹھوڑیاں ''سبز خال'' سے آراستہ ہوتی ہیں:

> ''ایک چبوترے پر وہ بہت ساری خوبصورت سرخ وسفید عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی ہے جن کے ماتھے اور ٹھوڑیوں پر سبز خال ہوتے ہیں۔''**(۲۰)**

افسانے میں لال کی محبوبہ اگر ایک طرف حقیقت میں لال کو قندھاری کشیدہ کاری سے مزین کُرتے میں ملبوس پاتی ہے تو تصوّر میں اپنے آپ کو دلہن کے روپ میں سبز شال اوڑھے اور ''لال'' کو دولہے کے روپ میں مشہدی پگڑی باندھے، گلے میں نوٹوں کے ہار پہنے دیکھتی ہے۔ اُس کے گرد خواتین کا حلقہ ہے جنہوں نے گول لمبا روایتی لباس پہن رکھا ہے۔ افسانہ ''بے اصولوں کے اصول'' میں بھی مرجانہ کے ہاں جب پنجاب سے سعیدہ آتی ہے تو وہ اسے نئے کپڑے سلوا کر دیتی ہے اور اپنے طرز پر اس کا سنگھار کرتی ہے۔ سعیدہ پٹھانوں کے لباس میں اپنی وضع قطع سے اتنی مختلف دکھائی دیتی ہے کہ اس کا بھائی بھی اسے پہلی نظر میں پہچان نہیں پاتا:

> ''سعیدہ نے پٹھانی لباس پہنا، مرجانہ نے اس کے باریک مینڈیاں گوندھیں، ٹھوڑی پر سرمے کا خال لگایا۔۔۔۔ دنداسے سے اس کے ہونٹ سرخ کر دیئے تھے اور دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے اور اس کی جسم سے رنبیل کی سوکھی کلیوں کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔''**(۲۱)**

پشتون معاشرے کی لڑکیوں میں مینڈھیاں گوندھنے، ٹھوڑی پر سرمے سے تِل لگانے، دانتوں کو ''دنداسے'' سے صاف کرنے اور رنبیل کے پھولوں کا بالوں میں ٹانکنے کا رواج عام ہے۔ اسی وجہ سے افسانے میں جب سعیدہ مرجانہ کے گھر آتی ہے تو وہ اس کے لیے ان لوازمات کا انتظام کرتی ہے۔

رحیم گل کے افسانہ ''توکلی مست'' میں بھی پشتون عورتوں کے لباس اور زیور کا ذکر کیا گیا ہے۔ افسانے میں جب توکلی مست اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک مہم پر جاتا ہے تو وہ راستہ بھول کر دوستوں سے بچھڑ جاتا ہے۔ اس موقع پر وہ پشتونوں کے ایک خانہ بدوش قبیلے کے خیمے میں داخل ہوتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک نئی نویلی دلہن سے ہوتی ہے۔ اس موقع پر رحیم گل اس لڑکی کے لباس کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:

> ''لڑکی نے چاندی کے بنے ہوئے زیور پہن رکھے تھے اور نئے سرخ جوڑے میں

ملبوس تھی۔۔۔۔ناک میں چارگل تھا اور تازہ تازہ باریک مینڈھیاں گندھی ہوئی تھیں۔ہاتھوں میں چاندی کے کڑے اور گلے میں چاندی کی دمکتی ہوئی ہنسلی تھی۔اس کی مانگ میں سندور بھرا ہوا تھا۔ہاتھوں اور پیروں میں مہندی رچی ہوئی تھی۔''**(۲۲)**

افسانے میں جس لباس اور جن زیورات کا ذکر کیا گیا ہے یہ سب پشتونوں کے روایتی لباس اور زیورات ہیں لیکن افسانے میں مانگ میں سندور بھرنا کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس کا پشتون معاشرے میں کوئی تصّور موجود نہیں۔مانگ میں سندور بھرنا صرف ہندو عورتوں کا رسم ہے مسلمانوں اور پھر پشتونوں میں اس رسم کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔

پشتون جہاں بھی جاتا ہے وہ اپنے مخصوص لب ولہجہ سے پہچانا جاتا ہے۔خصوصاً جب کوئی پشتون اردو زبان میں بات کرے تو صاف پہچانا جاتا ہے۔کیونکہ ایک تو پشتونوں کے اردو بولنے کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے دوسرے پشتون اردو بولتے ہوئے تذکیر وتانیث میں فرق نہیں کر پاتے۔وہ زیادہ تر مذکر کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر بولتے ہیں۔اردو افسانوں میں جہاں پشتونوں کو اردو میں باتیں کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے وہاں اکثر ان کے اردو بولنے کے اسی مخصوص انداز کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح اکثر افسانوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے پشتون کرداروں کو پشتو میں باتیں کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے۔رضا ہمدانی کے افسانہ''غوبل'' میں بھی ایک طرف پشتونوں کے مخصوص لہجے کو پیش کیا گیا ہے تو دوسری طرف پشتون کرداروں سے پشتو کے الفاظ بھی کہلوائے گئے ہیں۔پشتون جب کسی محفل میں داخل ہوتے ہیں تو ان کا استقبال کچھ اس انداز سے کیا جاتا ہے:

''السلام علیکم''

''وعلیکم السلام''

''استڑہ مشے''(ماندہ نہ باشی) اور''پخیر راغلے''(خوش آمدید) کے الفاظ ہر لمحہ فضا میں شہد کی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ پیدا کر رہے تھے۔''**(۲۳)**

اسی افسانے میں ایک اور موقع پر غندلؔ کا حجرے میں داخل ہوتے ہوئے پشتو زبان میں استقبال کا منظر کچھ یوں دکھایا گیا ہے:

''السلام علیکم''۔غندلؔ نے حجرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
''وعلیکم السلام''۔''پخیر راغلے''۔''استڑہ مشے''۔کی مختلف آوازوں نے غندل کا استقبال کیا۔''**(۲۴)**

مذکورہ دونوں اقتباسات میں باقی الفاظ کا استعمال صحیح کیا گیا ہے لیکن لفظ''استڑہ مشے'' کی ادائیگی درست نہیں۔کیونکہ یہ لفظ پشتون اس طرح ادا نہیں کرتے بلکہ اس کی ادائیگی کچھ اس طرح ہے کہ''سترٔے مشے یا استڑے

مشے'۔البتہ پشاور کے ہندکو بولنے والے پشتو بالکل اسی رنگ میں بولتے ہیں جس طرح ایک پشتون اردو بولتا ہے۔

کنہیا لال کپور نے افسانہ ''موسیٰ خان''میں بھی پشتونوں کا ایک دوسرے کے استقبال کا منظر اسی انداز سے پیش کیا ہے اور پشتو الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ موسیٰ خان کے کردار کے ذریعے اردو کا پٹھانی لب ولہجہ بھی پیش کیا گیا ہے۔افسانے میں جب موسیٰ خان اپنے گاؤں سے مزدوری کی غرض سے آتا ہے اور اپنے دوسرے،ہم پیشہ مزدوروں کی محفل میں داخل ہوتا ہے تو اس کے سلام اور باقی لوگوں کے خیر مقدم کا انداز کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے:

''السلام علیکم!
وعلیکم السلام۔موسیٰ خاں کیا حال ہے۔
خدا کا فضل اے۔تمہارا کیا حال اے
اللہ کی مہربانی ہے۔تڑاموشے
خو!تڑاموشے!!تڑاموشے!!!موسےٰ خان قہقہہ لگا کر ہنسنے لگتا۔''**(۲۵)**

''تڑے موشے''پشتو کا قندھاری لہجہ ہے جبکہ یوسف زئی لہجے میں'ستڑے مہ شے'بولا جاتا ہے جس کا مطلب''ماندہ نہ باشید''ہے۔اسی طرح''ہے''کی بجائے''اے''پٹھانی لہجہ ہے۔اکثر پشتون جب اردو میں بات کرتے ہیں تو ان کی زبان سے بے ساختہ''خو''کا لفظ نکل جاتا ہے۔'خو'کا اردو متبادل لفظ'تو'ہے۔لیکن عام طور پر یہ لفظ تکیہ کلام کے طور پر بھی بولا جاتا ہے۔اسی افسانے میں آگے چل کر ایک اور جگہ موسےٰ خان کا لہجہ ملاحظہ کیجیے:

''موسیٰ خاں تمہیں سردی نہیں لگتی''۔
سردی؟اِدر سردی نہیں ہوتا۔سردی تو امارے ملک میں ہوتا۔''
''موسیٰ خاں آگ تاپ لو''۔ایک نوجوان الاؤ کی طرف اسے مدعو کرتے ہوئے کہتا۔
''خو!تم کیسا جوان ہے''۔موسےٰ خاں ہنستے ہوئے جواب دیتا۔
''امولی سردی برداشت نہیں کرتا۔کابل میں ہوتا تو سردی سے مرجاتا۔''**(۲۶)**

یہاں''ع''کی بجائے''الف''کا استعمال بھی ایک پشتون ہی کے لہجے کا خاصہ ہے۔ایک اور جگہ موسیٰ خان کا بیٹا بھی دوسرے بچوں سے کچھ اس انداز میں گفتگو کرتا ہے:

''میرے بابا کے پاس بوہت روپی اے۔تم سب غریب چوکرا۔''**(۲۷)**

یہاں''بہت''کی بجائے''بوہت''،''ہے''کی بجائے''اے''اور جمع''چوکرے''کی بجائے''چوکرا'' بالکل فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے جس کے لیے اس نے ان پڑھ پشتون کرداروں سے ان کے اردو بولنے کا اپنا منفرد لب ولہجہ بُلوایا ہے۔جس سے افسانے میں حقیقی رنگ پیدا ہوگیا ہے۔

جس طرح پشتونوں کی تہذیب وثقافت میں ایک الگ اورایک ماورائی رنگ ملتا ہےاسی طرح پشتونوں کی اردو زبان کی ادائیگی اورار دولب ولہجہ بھی منفرد نوعیت کا ہے۔اردو افسانوں میں جہاں پشتونوں کا پاکستان کے دیگر علاقوں کے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے وہاں اکثر افسانوں میں پشتونوں کا پٹھانی لہجہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔پشتون جس طرح اردو زبان بولتے ہوئے تذکیر وتانیث میں فرق نہیں کرتے اسی طرح جمع اور واحد کے صیغے میں بھی ان سے لسانی لغزشیں ہوتی رہتی ہیں۔اکثر 'ہ' یا 'ھ' کو بھی الف سے تبدیل کر دیتے ہیں۔اس سلسلے میں رابندر ناتھ ٹیگور کے افسانہ ''کابلی والا'' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''چلتے وقت کابلی نے مجھ سے دریافت کیا۔''بابو جی تمھارا وہ لڑکی کدھر گیا''۔۔۔۔
''مِنی بابا تم سسرال کبھی نہیں جائے گا''۔۔۔۔''رحمت اپنے فرضی سسر کو نشانہ بناتے ہوئے ایک بھاری گھونسہ اُٹھا کر کہا کرتا''ام اپنا سسر کو اس سے ماریں گا۔''(۲۸)

ایک دفعہ جب''رحمت کابلی والا''ایک شخص کو چھری سے وار کر کے زخمی کر دیتا ہےاوراسے پولیس والے پکڑ کر لے جارہے ہوتے ہیں تو''مِنی''اس سے دفعتاً پوچھ بیٹھتی ہے کابلی والے تم سُسرال جارہے ہو تو وہ کہتا ہے:

''ان سسران کو ام مار کے پڑا کر دیتا لیکن کیا کرے ہاتھ بندھا ہے۔''(۲۹)

رحمت کابلی والا جب مِنی کو میوہ دیتا ہےتو افسانہ نگار رحمت کو اس کے دام دینا چاہتا ہےاس موقع پر رحمت اپنے پٹھانی لہجہ میں کہتا ہے:

''بابو جی آپ ام پر برابر مہربانی کیا ہے۔سوام کبھی بھول نہیں سکتا۔ام کو دام مت دو۔ بابو جی تمھارا جیسی لڑکی ہے ویسا دیس میں ہمارا بھی ایک لڑکی ہے۔ام اس کو یاد کر کے آپ کی لڑکی کے واسطے کچھ میوہ لے آیا کرتا ہے۔ام آپ کا پاس سودا بیچنے نہیں آتا۔''(۳۰)

بانو قدسیہ کے افسانہ''موم کا پُتلا''میں بھی گل خان نام کا ایک پٹھان کردار پیش کیا گیا ہے۔گل خان کوانھوں نے اردو کے پٹھانی لب ولہجے میں بات کرتے ہوئے دکھایا ہے۔افسانے میں گل خان ایک جج کے ساتھ بطورِ ڈرائیور کام کرتا ہے جب وہ اپنے مالک کے گھر سے ناراضی کی حالت میں نکلتا ہےتو اس کے مالک کی بیٹی ''عیشہ''اس سے اس کے جانے کا پوچھ رہی ہے تو گل خان اپنے انداز سے کہتا ہے''جی صیب؟''اور جب عیشہ اس سے جانے کی وجہ پوچھتی ہےتو وہ کہتا ہے:

''جی سر دانہ پانی ختم ہوگیا۔۔۔۔۔جب ہمارا دانہ پانی پشاور سے ختم ہوگیا تھا تو ام ایدھر آ گیا۔۔۔۔۔اب اللہ سے کہیں اور مقرر ہو گیا تو۔۔۔۔۔''(۳۱)

اور جب عیشہ اس کے اس فیصلے کے بارے میں اس سے استفسار کرتی ہے کہ اس فیصلے کا اس

پر کیا اثر پڑنے والا ہے تو وہ کہتا ہے۔''آ جی معلوم اے۔۔۔۔''اس کے بعد عیشہ اس سے کہتی ہے کہ پھر بھی وہ چلا جائے گا تو وہ کچھ اس انداز سے بات کرتا ہے''آ جی۔۔۔۔یہ ضروری اے یرا جی۔۔۔۔''اسی طرح افسانے میں گل خان کا کردار پیش کرتے ہوئے مختلف جگہوں میں افسانہ نگار نے اس کو پٹھانی لہجے میں، تذکیر و تانیث کی غلطیاں کرتے ہوئے دکھایا ہے۔گل خان جب شہر جانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا باپ کچھ اس انداز سے اس کے ساتھ گفتگو کرتا ہے''اویرا گل خان تم تر وجبا چھوڑ کر جاتا ہے۔''**(۳۲)**

اسی طرح عیشہ کے گھر سے جب گل خان اپنے گھر جانے کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس موقع پر اس کی گفتگو کو یوں پیش کیا گیا ہے:

''خاں تو تمہارا ارادہ تر وجبا جانے کا ہے۔''

''آ جی۔۔۔۔۔۔۔''

''لیکن۔۔۔۔۔۔۔''

لیکن کا وقت گزر چکا اے جی۔۔۔۔۔۔۔۔''**(۳۳)**

جب عیشہ اس کے ساتھ جانے کا ارادہ ظاہر کرتی ہے تو گل خان کہتا ہے:

''اوتو ٹھیک اے جی لیکن ام آپ کو ساتھ لے جا نہیں سکتا۔''**(۳۴)**

افسانے میں جو لہجہ گل خان کی زبانی پیش کیا گیا ہے وہ بالکل عین فطری ہے۔پشتون اردو بولتے ہوئے اسی لہجے میں باتیں کرتے ہیں۔پشتون عام طور پر''ہ'' کی بجائے''الف''بولتے ہیں صاحب کو صیب،اعتبار کا''ع'' حذف کر کے اتبار بولتے ہیں۔اسی طرح پشتو کے الفاظ''یرا''اور''خو'' کا استعمال بھی اردو بولتے وقت کثرت سے کرتے ہیں۔خاص کر غصّہ یا ناراضی کی حالت میں ان کی زبان سے یہ دو لفظ ضرور نکلتے ہیں۔مذکورہ افسانے میں گل خان کے لہجے سے صاف صاف پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ایک پٹھان ہے یہی بات اس افسانے کو حقیقت کے قریب لے آتا ہے۔افسانہ''خاموش نگاہیں''میں بھی جب ولی خان کو بمبئی فلم انڈسٹری کی ایکٹرسیں چھیڑنے لگتیں ہیں کہ وہ شادی کر لیں کیونکہ ہنسنے اور کھیلنے کے یہی دن ہیں، پھر وہ بوڑھا ہو جائے گا۔تو اس موقع پر ولی خان ہنس کر کہتا ہے:

''تم لوگ ٹھٹھا کرتا ہے۔ہم سب سمجھتا ہے لیکن ہم ایسا شادی نہیں کرے گا۔''**(۳۵)**

اگرچہ ولی خان کا بمبئی میں یہ چوتھا سال ہوتا ہے۔وہ اردو زبان سیکھ بھی لیتا ہے پھر بھی پشتونوں سے اردو بولنے میں تذکیر و تانیث کی جو غلطیاں سرزد ہوتی ہیں وہ یہاں ولی خان سے بھی ہوتی ہیں۔افسانہ''پیاسے خواب''میں بھی جب چندا کپڑا بیچنے والے پٹھان سے کہتی ہے کہ اسے سفید رنگ کا کپڑا پسند ہے اس کے پاس ہوگا تو وہ اپنے مخصوص پٹھانی لہجے میں اس سے یوں ہم کلام ہوتا ہے:

''ہے جی۔۔۔۔اماری جھگی میں سفید رنگ کا بہترین کپڑا ہے ام کل لا دیں

گا۔۔۔''(۳۶)

اسی طرح جب ایک دن چندا اس سے کپڑا لے لیتی ہے اور پیسے ہوتے ہوئے بھی یہ کہتی ہے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں تو شیر خان کچھ اس انداز سے بات کرتا ہے:

''اچھا جی۔۔۔۔۔جب مرضی ہو، پیسے دے دینا۔۔۔۔۔ام جی بندے بندے کو پہچانتے ہیں آپ سال بھی پیسے نہ دیں تو کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔اخیر کار مل ہی جائیں گے۔''(۳۷)

افسانے میں ایک اور جگہ پر شیر خان کی ماں جب چندا سے بات کرتی ہے تو اس کا لہجہ بھی پشتو آمیز ہوتا ہے:

''تم امارا شیر کی پسند ہے تو امارا بھی پسند ہے۔ام سے تجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔پر تو امارے عزت کا خیال رکھے گی۔شیر تم بہو کو جھگیوں کے تمام رسم و رواج سے آگاہ کرو۔ام لوگ غریب تو ہے پر اپنی عزت پر مرمٹتا ہے۔''(۳۸)

افسانے میں جگہ جگہ کرداروں کو پشتو آمیز لہجے میں باتیں کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے جن سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ پشتون جب اردو میں باتیں کرتے ہیں تو ان کا لہجہ بھی دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص ان کے لہجے سے واقف ہو تو وہ صرف ان کی باتیں سن کر بھی پہچان سکتے ہیں کہ بولنے والا پشتون ہی ہے۔

اردو افسانوں میں جہاں پشتون تہذیب وثقافت کو پیش کیا ہے وہاں نہ صرف پشتونوں کے اردو بولنے کا پٹھانی لب ولہجہ دکھایا گیا ہے بلکہ ان کے انداز گفتگو اور مکالموں کے جذباتی انداز کی بھی بہت خوبصورت انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔قیوم مروت کے افسانہ ''اللہ بچائیو!'' میں ایک روایتی پشتون ''خان صاحب'' کا کردار پیش کیا گیا ہے جس نے بڑی سی پگڑی سر پر باندھ رکھی ہے۔وہ ایک بینک میں داخل ہو کر منیجر صاحب سے بینک سے قرضہ لینے کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔افسانہ نگار نے خان صاحب کا کردار، اس کا لب ولہجہ اور جذباتی انداز کا خاکہ یوں کھینچا ہے:

''مانی جر صاحب امارا آپ کے پاس بوت بڑا اکاؤنٹ ہے۔
اگر ہم کو قرضہ کا ضرورت پڑا؟''
میں نے کہا ''کتنا قرضہ چاہیے؟''
''لاک۔دو لاک''(۳۹)

منیجر صاحب اسے سمجھاتا ہے کہ قرضہ اسے ملے گا لیکن کچھ فارم وغیرہ پر کرنا پڑیں گے اور ضمانت بھی دینی ہوگی۔ضمانت کے لفظ پر خان صاحب کا پارہ فارن ہائٹ کے آخری درجہ سے ٹکراتا ہے:

''چوڑوں یار۔ضمانت کیسا۔اَم خود ضمانت نی اے کیا۔''(۴۰)

اتنے میں چپڑاسی منیجر صاحب کے مہمانوں کے لیے بوتلیں لے آتا ہے تو وہ خان صاحب سے کہتا ہے کہ

آپ پئیں گے؟ تو خان صاحب بالکل اپنے روایتی انداز میں جواب دیتا ہے کہ ''کیوں نئیں پئے گا۔'' چپڑاسی منیجر صاحب کے کہنے پر مزید بوتلیں لے آتا ہے اور ایک بوتل، خان صاحب کو پیش کرتا ہے۔خان صاحب کے بوتل پینے کا انداز بھی اس کے کردار کی سادگی اور فطری پن کا مظہر ہے۔پشتونوں میں جو لوگ نسوار کے عادی ہوتے ہیں وہ حسب عادت کھانے پینے کے بعد منہ میں نسوار ضرور رکھتے ہیں۔خان صاحب بھی جب بوتل پی لیتا ہے تو اس کے بعد نسوار منہ میں رکھ لیتا ہے اور نسوار رکھنے کے بعد گفتگو جاری رکھتا ہے۔خان صاحب اپنے روایتی لہجے میں گفتگو شروع کرتے ہوئے کہتا ہے:

''مانی جر صاحب۔اَم کو قرضہ دو۔اَم نے گاڑی کا سودا کیا ہے۔''(۴۱)

منیجر صاحب انکساری سے اسے سمجھاتا ہے کہ وہ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں روپیہ دینے کو بھی تیار ہے لیکن بینک کے ضابطے اور قانون کے مطابق۔ایسے موقعوں پر ایک پٹھان کا جذباتی ہونا ہی اس کی فطرت ہے۔کیونکہ روایتی پشتون ضابطہ اور قانون سے آزاد زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔جہاں کسی قانونی طریقۂ کار کو اپنے رستے میں رکاوٹ دیکھتے ہیں وہاں قانون سے بغاوت پر اُتر آتے ہیں۔اس موقع پر افسانہ نگار خان صاحب کے جذباتی رویے، جذباتی انداز اور پشتون لب و لہجے کو بڑے فطری انداز میں پیش کرتا ہے:

''اَم قانون کو نئیں جانتا۔اَم روپیہ مانگتا ہے۔اتبار پر۔
آپ اَم پر اتبار نہیں کرتا۔تو اَم تم پر اتبار نئیں کرتا۔
اَم اکاؤنٹ دوسرا بینک میں لے جائے گا۔''(۴۲)

اسی طرح خان صاحب اپنے مزاج کی تندہی اور فطری جذباتیت کی رو میں بہہ کر اپنا اکاؤنٹ کسی دوسرے بینک لے جانے کی دھمکی دے کر چلا جاتا ہے۔پشتون جب کسی کا نام پکارتے ہیں تو ایسا نام جس کے آخر میں ''الف'' یا ''ہ'' آتا ہو اُسے ''ے'' میں اور جن ناموں کے آخر میں مذکورہ حروف کے علاوہ کوئی اور حرف آتا ہو انہیں ''الف'' یا ''ہ'' میں تبدیل کرتے ہیں۔اور تحقیر کے لیے ''ے'' سے تبدیلی لائی جاتی ہے۔اسی طرح افسانہ ''خشک چٹانیں'' میں جب عبدالمجید اپنی بیٹی ''گل سانگہ'' کو آواز دیتا ہے تو اُسے گل سانگہ کی بجائے ''گل سانگے'' کے نام سے پکارتا ہے۔افسانہ ''بے کفن'' میں بھی جب قاسم، عزیز خان کے حجرے پر جاتا ہے تو عزیز خان اُسے ''قاسمہ'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔یہ انداز اور لہجہ خالص پشتون معاشرہ کا مظہر ہے:

''قاسمہ! حکومت نے مجھے کہلا بھیجا ہے کہ اگر کاظم اور قاسم کو ڈاکہ زنی سے نہ روکا تو ''دلنگی'' ضبط۔''(۴۳)

افسانہ ''بیری کا درخت'' (۴۴) میں نصیر ایوب کو مخاطب کرتے ہوئے اسے ایوبے کے نام سے پکارتا ہے۔سحر یوسف زئی کے افسانہ ''کھلا صندوق''(۵۴) میں بھی نادر نام کے کردار کو ''نادریہ'' کے نام سے مخاطب

کیا گیا ہے۔افسانہ ''شعلہ خو''میں جب سیدی اپنے بھائی کے قاتل نامدار کو دکان سے سودا رسلف لیتے ہوئے دیکھتا ہے تو اسے غصّے اور حقارت کے انداز میں مخاطب کرتے ہوئے یوں پکارتا ہے:

''نامدارے! اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔''(۴۶)

اسی طرح سیدی جب اپنے دشمن نامدار کو پکارتا ہے تو وہ نامدار کی بجائے نامدارے کہتا ہے۔ایسے نام اپنے چھوٹوں یا اپنے سے کمتر شخص کے لیے بھی بولے جاتے ہیں۔عام طور پر بیوی کو بھی اسی طرح مخاطب کیا جاتا ہے۔افسانہ ''ناتمام آرزو''(۴۷) میں عنایت اپنی بیوی مہ جبیں سے جب بات چیت کرتا ہے تو اسے مہ جبیں کی بجائے ''مہ جبینے'' کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔طاہر آفریدی کے افسانہ ''آنکھیں راستے'' میں زرجان کی ماں اسے اس طرح آواز دیتی ہے:

''آرام سے زرجانہ آرام سے پیئو۔پانی کہیں بھاگ تو نہیں رہا ہے۔''(۴۸)

اسی افسانہ میں شاہ مکہ نامی عورت سے اس طرح بات پوچھی جاتی ہے:

''خالہ شامکئے! کہاں گئیں تھیں بہت تھکی ہوئی ہو۔''(۴۹)

افسانہ ''سہارے''(۵۰) میں جب سرورے کا بیٹا بیمار ہو جاتا ہے اور وہ تنگ دستی کی وجہ سے اپنے بیٹے کے لیے دوا نہیں لاسکتا تو بہت پریشان ہو جاتا ہے لیکن جب گھاس کا گٹھا بارہ آنے کے عوض فروخت کر دیتا ہے تو اُس کے دل کی کلی کھل اُٹھتی ہے۔وہ جلدی جلدی ڈسپنسری پہنچتا ہے تاکہ اپنے بیٹے کے لیے دوا خرید لے۔ڈاکٹر کو مخاطب کرتے وقت سرورے کا ڈاکٹر صاحب کو ''ڈانکڑ رصیب'' کہنا افسانے میں پشتون لب و لہجے کا واضح عکس ہے۔افسانہ ''شندی گل'' میں بھی لٹو بابو صاحب کی بجائے بابوصیب کا لفظ استعمال کرتا ہے یہ لفظ پشتون اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔

پشتون کلچر کی انفرادیت نہ صرف ان کے لباس میں ہے بلکہ پشتونوں کی زبان بھی ان کی اس انفرادیت کا ثبوت ہے۔ہزاروں سال کا چکر کاٹنے کے بعد یہ زبان اپنی پختگی کی انتہا پر پہنچ گئی ہے۔اس زبان میں بھی اردو کی طرح یہ خاصیت موجود ہے کہ ہر زبان کا لفظ اس میں سموسکتا ہے۔اس زبان کی انجذابی قوت اور لچک نے اس کو دوسری زبانوں سے اخذ و قبول کے ذریعے مالا مال کر دیا ہے۔پشتو زبان بولنے کا اپنا لہجہ ہے جو افغانوں کی دری زبان سے متاثر ہے۔پشتو زبان کے اصول وضوابط اردو سے کافی حد تک مختلف ہیں اس لیے جب پشتون اردو بولتے ہیں تو وہ پشتو کے انداز میں بولتے ہیں۔جہاں بھی کوئی پشتون اردو زبان میں بات کرتا ہے تو واضح طور پر پہچانا جاتا ہے کہ یہ شخص پشتون ہے۔اسی طرح پشتو کے بعض الفاظ کثرت استعمال سے بول چال میں پشتونوں کا تکیۂ کلام بن چکے ہیں اس لیے اردو بولتے ہوئے بھی اکثر ان کی زبان پر یہی الفاظ آتے رہتے ہیں۔جیسے زہ

مڑہ (جانے بھی دو)، اورے کہ نہ (سناتم نے)، پوھہ شوے (کیا سمجھے) وغیرہ۔ طاہر آفریدی کے افسانہ ''کھلا صندوق'' میں پشتو کے الفاظ کا اسی انداز سے مختلف موقعوں پر استعمال کیا گیا ہے:

''زہ مڑہ! آج کی ہار قمرو کے سر کا صدقہ!''(۵۱)

یہاں ''زہ مڑہ'' کا پشتو لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ''چھوڑ و یار یا جانے بھی دو'' کے ہیں۔ افسانہ ''عطایا سزا''(۵۲) میں بھی پشتو کے لفظ ''اوئے بد بختا'' استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب ''او بد قسمت'' ہے۔ اسی طرح محمد خالد اختر کے افسانہ ''کاریز''(۵۳) میں دو جگہوں پر پشتو کے لفظ ''دَوَس'' کا استعمال کیا گیا ہے۔ دوَس پشتو زبان میں بے غیرت یا بزدل کو کہا جاتا ہے۔

فصل کی کٹائی کو پشتو زبان میں ''لَوْ'' کہتے ہیں۔ جبکہ مسجد میں غربت کے مارے علم دین حاصل کرنے کے لیے جو طالب علم رہتے ہیں ان میں چھوٹی عمر والوں کو ''چنڑ یں'' کہتے ہیں۔ (چ کے بعد ن کو غنہ پڑھنا چاہیے) اسی طرح معمولی سی بندوق کو شلغئ کہا جاتا ہے۔ اور خوشی کی محفلوں میں ناچنے والے لڑکوں کو لختئ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ پشتو زبان کے ان ناموں کو افسانہ ''غوبل'' میں یوں استعمال کیا گیا ہے:

''ہم نے تو آج لَوْ کرنا ہے غنی نے کہا۔''(۵۴)

لفظ چنڑ یں کا استعمال کچھ اس طرح کیا گیا ہے:

''جن کے جنازے کے ساتھ مسجد کے امام نے بھی بے اعتنائی برتی اور ''نمازِ جنازہ'' کے لیے ''چنڑ یں'' کو بھیجنا کافی سمجھا۔''(۵۵)

سحر یوسفزئی کے ایک اور افسانے ''زیتون اور نرگس''(۵۶) میں بھی مجلسی آدمی کو ''گپّی'' کہا گیا ہے۔ افسانہ ''بیٹی کا بوجھ''(۵۷) میں ''نائیک'' کے لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ نائیک پشتو میں آقا یا سردار کو کہتے ہیں۔ جبکہ افسانہ ''فصیلیں''(۵۸) میں خان کاکا، کا نوکر صنوطہ خان ''کخے'' کے نام سے مشہور ہو جاتا ہے۔ کخے پشتو میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ہر شخص کے کام سے کام رکھتا ہو۔ دخل در معقولات کرنے والے کو استہزا کے طور پر کہا جاتا ہے۔ دوسروں کی بات میں ٹانگ اڑانے والا بھی کخے کہلاتا ہے۔ کھیتوں اور باغوں کی رکھوالی کرنے والے شخص کا بھی کخے اصطلاحی نام ہے۔ درمحمد کاسی کے افسانہ ''آخری ملاقات''(۵۹) میں پشتو لفظ ''گوڈ'' کا استعمال ملتا ہے۔ ''گوڈ'' پشتو زبان میں لنگڑے کو کہتے ہیں۔ اور بسا اوقات لنگڑے شخص کے نام کے ساتھ ''گوڈ'' کا سابقہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے فلاں گوڈ یعنی فلاں لنگڑا۔ افسانہ ''دعائے مغفرت''(۶۰) میں طاہر آفریدی نے میرو نام کے لڑکے کا کردار پیش کیا ہے۔ بھولا پن کی وجہ سے لوگوں نے اُسے دیوانہ بنا دیا ہے۔ میرو کا مذاق اُڑانے والے بچے اُسے پاگل سمجھتے ہوئے ''لیونے'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ ''لیونے'' پشتو زبان میں دیوانے اور مخبوط الحواس شخص

کو کہتے ہیں۔افسانے میں دہلیز کے لیے پشتو لفظ ''درشل'' کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔شمیم فضل خالق کے افسانہ ''الٹاوار'' میں بھی پشتو لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔افسانے میں ایک گھر میں نئی نوکرانی آتی ہے۔جب اس سے اس کا نام پوچھا جاتا ہے تو وہ اپنا نام یوں ظاہر کرتی ہے:

''پشمینہ نام ہے میرا۔آپ پشو کہہ دیا کریں جی۔سب یہی کہتے ہیں۔''
میرے بچے کھی کھی کرکے ہنسنے لگے اس لیے کہ ''پشو'' پشتو میں بلی کو کہتے ہیں۔''(۶۱)

افسانہ ''کھلا صندوق'' (۶۲) میں قائد کے لیے ''مشر'' کے نام کا استعمال کیا گیا ہے۔ (۶۳) افسانہ ''خشک چٹانیں'' میں دشمن کے لیے ''تربور'' کا پشتو لفظ استعمال کیا گیا ہے۔افسانے میں مدرسے کے طالب کے لیے پشتو نام ''چنڑے'' کا استعمال بھی ملتا ہے۔اسی طرح ایک اور جگہ پر ''شین گٹ'' کے نام سے ایک گاؤں کا ذکر ملتا ہے۔پشتو میں ''شین گٹ'' سبز پتھر کو کہتے ہیں۔بندوق کے ایک قسم کے لیے پشتو کے نام کا استعمال ملاحظہ ہو:

''ہم تم ایسے غریب۔لکڑ جیسے بھوکے ننگے خان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔جن کے پاس شَلَئیَ تک بھی نہیں۔''(۶۴)

سحر یوسف زئی افسانہ ''سائے'' (۶۵) میں تازہ گل اپنی بیوی کے لیے کراچی سے ناریل لانا بھول جاتا ہے۔اس موقع پر افسانہ نگار لفظ ناریل کی بجائے پشتو لفظ ''کھوپرہ'' استعمال کرتا ہے۔کیونکہ اس لفظ کے پیچھے پشتون معاشرے کی رومانی روایتیں موجود ہیں۔گئے وقتوں میں پشتون دیہاتی علاقوں میں اکثر اپنی محبوبہ کے لیے ''کھوپرہ'' لایا جاتا تھا۔افسانہ نگار ناریل کے نام سے وہ تاثر نہیں ابھار سکتا جو لفظ کھوپرہ سے پیدا کر سکتا ہے۔

افسانہ ''پنگھٹ پر'' (۶۶) میں پشتو لفظ ''گھانی'' کا استعمال کیا گیا ہے جو پشتو زبان میں گنے پیلنے اور گڑ بنانے کی جگہ کو کہا جاتا ہے۔ افسانہ ''سہارے'' (۶۷) میں پشتو کے لفظ ''بوساڑے'' استعمال کیا گیا ہے۔ ''بوساڑہ'' کا مطلب ہے بونگی یعنی بھوسے کا ڈھیر جسے لیپ پوت کر مخروطی شکل دے دی جاتی ہے۔اس میں بھوسا محفوظ رہتا ہے۔افسانہ ''اندھیرے کا بیٹا'' (۶۸) میں پشتو لفظ ''شوٹئی'' کا استعمال موجود ہے۔''شوٹئی'' پشتو میں اس روغنی لکڑی کو کہا جاتا ہے جسے روشنی یا گیلی لکڑیوں کو آگ دینے کے لیے جلایا جاتا ہے۔

فہمیدہ اختر کے افسانہ ''یہ بہار کا قصّہ ہے'' (۶۹) میں بھی اردو لفظ ''خوش آمدید'' کی بجائے اس کا متبادل پشتو لفظ ''پہ خیر راغلے پہ خیر راغلے'' کا استعمال کیا گیا ہے۔افسانہ ''بیری کا درخت'' میں نصیر ایوب کو مخاطب کرتے ہوئے اسے ایوبے کے نام سے پکارتا ہے۔اسی طرح اسی افسانہ میں ''پولا'' کا پشتو لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے جو کہ پشتو زبان میں کھیت کے مینڈھ کو کہتے ہیں۔اسی افسانے میں نصیر خان جب ملک فیروز کے حجرے میں داخل ہوتا ہے اور حجرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر سلام کہتا ہے تو اس کے جواب میں ملک فیروز خان کہتا ہے:

''آؤ۔آؤ۔میلمہ (مہمان) پخیر راغلے آؤ بیٹھو۔''(۷۰)

پخیر راغلے بمعنی خوش آمدید۔ ماندہ نہ باشد اور خوش آمدید کے لیے پشتو لفظ کا استعمال افسانہ ''اعتراف'' میں بھی ملتا ہے:

''اُسے دیکھتے ہی سترٔے مشے اور پخیر راغلے کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔''(۷۱)

حیات اللہ کا کڑ کے افسانہ 'اشر' میں جب چاچا شنگل، عجب گل کی طرف آتا ہے اور اسے سلام کرتا ہے تو عجب گل اس کے سلام کا جواب کچھ یوں دیتا ہے:

''وعلیکم السلام۔ پہ خیر، پہ خیر۔ شنگل خان آج ادھر کیسے؟''(۷۲)

''پہ خیر'' کا مطلب ہے خوش آمدید۔ افسانے میں ایک اور جگہ بھی خوش آمدید کے لیے اسی لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح ''اشر'' کا پشتو لفظ بھی افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے اور افسانے میں اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ ''اشر'' پشتون کلچر میں اس عمل کو کہا جاتا ہے جس کی رو سے کسی کام میں کسی شخص کا ہاتھ بٹھانے کے لیے بہت سے آدمی بلامعاوضہ شریک ہوجائیں۔ جو لوگ اس عمل میں شریک ہوتے ہیں انہیں ''اشرگر'' کہا جاتا ہے۔ افسانے میں اشرگر کی اصطلاح کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔

زیتون بانو کے افسانہ ''دوشیزگی کی نشانی''(۷۳) میں پشتو لفظ ''تربور'' کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ پشتو زبان میں چچازاد بھائی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور دشمن کے لیے بھی۔ چونکہ پشتونوں میں زیادہ تر لڑائی جھگڑوں کی جڑ جائیداد ہوتی ہے اور جائیداد کے مسائل چچیروں کے مابین ہوتے ہیں اس لیے ''تربور'' بھائی کم اور دشمن زیادہ ہوتے ہیں اس لیے اس لفظ کو دشمن کے مترادف کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ مذکورہ افسانے میں یہ لفظ چچازاد بھائی کے لیے استعمال کیا گیا ہے لیکن عام طور پر یہ لفظ دشمن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ افسانے میں ایک جگہ لفظ ''پشتو'' کو غیرت کے مترادف کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے جبکہ دوسری جگہ اسی لفظ کو حیا کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ پشتونولی میں لفظ ''پشتو'' کو بھی مختلف معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ شرم وحیا اور غیرت جیسے رویے بھی پشتو لفظ میں پوشیدہ ہیں۔ اشفاق احمد نے اپنے افسانہ ''بدنی ضرورت''(۷۴) میں بھی زرینہ اور پشمینہ کے چچیروں حسن خان اور گل زمان کے لیے تربور کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن اس افسانے میں ''تربور'' کا لفظ دشمن کے معنوں میں نہیں بلکہ چچازاد کے رشتے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ منور رؤف کا افسانہ ''دروند پختون''(۷۵) میں بھی مقامی الفاظ کا خوبصورت اور بے ساختہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ''تربور'' اور ''دروند پختون'' اس کے علاوہ پشتو کے فقرے بھی موجود ہیں جیسے، ''ٹوپک زما قانون دے''، یعنی بندوق ہی میرا قانون ہے۔ اسی طرح ''غیرت زما قانون دے''، یعنی غیرت ہی میرا قانون ہے۔

اردو افسانوں میں مختلف گاؤں، پہاڑوں، سمندروں، نالوں، کھِنالوں، پرنالوں، کھیتوں اور باغوں،

رسموں، پیشوں، خاندانی رشتوں کے لیے احترام محبت یا کسی تاریخی واقعے کی یاد کے طور پر وضع کردہ نام بھی خالص پشتو کے ہیں۔ یہ ایسے نام ہیں جو کسی دوسرے کلچر میں نہیں سنے گئے ہیں بلکہ خالص پشتون ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ طاہر آفریدی کے افسانہ 'متاعِ جاں'(۷۶) میں اسی طرح کے دو مختلف پہاڑوں کے نام موجود ہیں جن کے نام خالص پشتون کلچر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ایک ''پیتاو'' نامی پہاڑ کا ذکر ہے اور دوسرا ''سیرل'' نامی پہاڑ کا نام آتا ہے۔ جن کے معنی بالترتیب دھوپ سینکنے اور چیر کر پھاڑنے کے ہیں۔ افسانہ 'برات'(۷۷) میں پشتو کے لفظ ''کنڈاو'' کا ذکر آیا ہے۔ کنڈاو پشتو زبان میں پہاڑی علاقوں کے اس درّہ نما راستے کو کہا جاتا ہے جہاں چڑھائی ختم ہو کر اترائی شروع ہوتی ہے۔

پشتون پہاڑی علاقوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جہاں اپنے علاقے کی جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے ہیں۔ بعض جڑی بوٹیوں کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں جانور نے فلاں حالت میں اس کو کھایا تھا، اس لیے وہ جانور کے فطری علاج کو سامنے رکھتے ہوئے اسی جڑی بوٹی سے اپنا علاج بھی کراتے ہیں۔ ان جڑی بوٹیوں میں ایک ''مولائی'' بھی ہے۔ افسانہ 'دف' میں اس کا ذکر موجود ہے۔ یہ ایک پہاڑی پودا ہے اور پہاڑی لوگوں کے مطابق جانور اپنے زخموں کے علاج کے لیے اس پودے کا سہارا لیتے ہیں۔ فاروق سرور نے افسانے کی بڑھیا دادی کے کرب کو بیان کرنے کی خاطر تشبیہاً استعمال کیا ہے۔ بُڑھیا اپنے بیٹے کی غم میں نیم پاگل ہوتی ہے۔ وہ حیرت و تعجب کے عالم میں چاروں طرف یوں دیکھتی رہتی ہے کہ جیسے زخمی ہرنی 'مولائی' ڈھونڈ رہی ہو:

> ''اب دادی کی آنکھیں چاروں طرف کسی چیز کو یوں تلاش کرنے لگیں جیسے زخمی ہرنی پہاڑوں میں ''مولائی'' کو ڈھونڈتی ہے تا کہ وہ اسے چاٹے اور اپنی زخموں کا علاج کرے۔''(۷۸)

اسی طرح افسانہ ''گردِ صحرا''(۷۹) میں ''جنج'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو پشتو میں بارات کو کہا جاتا ہے۔ پشتون عام طور پر اپنی ماں، خالہ یا کسی بڑھی بوڑھی عورت کو ادب اور احترام کے واسطے ''بے بے'' کے نام سے پکارتے ہیں۔ جس کی مثال طاہر آفریدی کے افسانہ ''پگڑی''(۸۰) میں موجود ہے۔ افسانے میں گلنار اپنی ماں کو 'بے بے' کے نام سے پکارتی ہے۔ ماں کے علاوہ وہ ماں برابر عورت کے نام کے ساتھ لاحقہ کرتے ہیں۔ طاہر آفریدی کے افسانہ ''ٹھنڈک''(۸۱) میں بھی گل فانہ کی نند اُسے 'گل فانہ بے بے' کے نام سے پکارتی ہے۔ افسانہ ''دف''(۸۲) میں جہاں پشتون معاشرے کے دیگر ثقافتی عناصر موجود ہیں وہاں موقع اور محل کی مناسبت سے پشتون ثقافت میں گھلے ہوئے الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ افسانے کے ستر سالہ بڑھیا کردار کو لوگ ''دادی'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ جبکہ وحیدہ فرحت کے افسانہ ''بے اعتبار''(۸۳) میں زرک خان

اپنی ماں کو’’مورکئ‘‘ کے نام سے پکارتا ہے۔مور پشتو زبان میں ماں کو کہتے ہیں جبکہ مورکئ،مور کا اسمِ تصغیر ہے جو لاڈ اور پیار کی وجہ سے بچے اپنی ماں کو پکارتے ہیں۔ یہ نام پشتون معاشرہ میں بزرگوں کے ادب واحترام کی غمازی کرر ہا ہے۔دوسری بات یہ کہ ایسے نام بالخصوص پشتون معاشرے میں مستعمل رہے ہیں۔پشتون دوشیزائیں جب خوشی کی تقریبات میں رقص وموسیقی کا مظاہرہ کرتی ہیں تو موقع بہ موقع جذبات اُبھارنے اور رنگ جمانے کی خاطر ’’الے‘‘ کا نعرہ لگاتی ہیں۔یہ انداز خالص پشتون ثقافت کا عنصر ہے۔اس افسانے میں بھی لڑکیاں دادی کے سامنے ناچتے ہوئے یہی نعرہ لگاتی ہیں۔

زیتون بانو کے افسانہ’کانچ کے ٹکڑے‘(۸۴) میں ’’نیندرہ‘‘ کا پشتو لفظ استعمال کیا گیا ہے۔نیندرہ پشتو زبان میں ان پیسوں کو کہا جاتا ہے جو طوائف کو ناچ کے دوران دیے جاتے ہیں جبکہ بیاہ پر جو رقم بطورِ امداد دی جاتی ہے اُسے بھی ’’نیندرہ‘‘ کہا جاتا ہے۔مذکورہ افسانے میں یہ لفظ اسی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔پشتون معاشرے میں نیندرہ کی رقم بدل کے طور پر دی جاتی ہے۔یہ رسم عام طور پر عورتوں میں پائی جاتی ہے۔پشتون کلچر میں عورتیں کسی شادی بیاہ میں شرکت کے لیے جاتی ہیں تو وہ اُن گھر والوں کو بطورِ نیندرہ کچھ رقم یا دوسرا کوئی تحفہ دیتی ہیں۔جن کو جتنا نیندرہ دیا جاتا ہے وہ اس کی تعداد یا حیثیت یاد رکھتے ہیں۔وقت آنے پر نیندرہ کے نام سے اس کا بدلہ چکایا جاتا ہے۔البتہ اس پر اپنی حیثیت کے مطابق بڑھانے سے اس اچھی رسم کو بڑھاوا دیا جاسکتا ہے۔مذکورہ افسانے میں اس لفظ کا انہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔افسانے میں ایک اور لفظ’’منجیلہ‘‘ کا بھی استعمال ملتا ہے۔پشتو زبان میں گھڑا سر پر رکھنے کے لیے گھاس پونس یا کپڑے وغیرہ کو لپیٹ کر جو اینڈوا بنایا جاتا ہے اُسے’’منجیلہ‘‘ کہتے ہیں۔یہی لفظ زیتون بانو کے ایک اور افسانے’’صوالئ‘‘(۸۵) میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔جبکہ خود لفظ’’صوالئ‘‘ بھی پشتو کا لفظ ہے۔یہ لفظ اصل میں ’’سوالئ‘‘ ہے جس کا معنی ہے سوال کرنے والی یا بھیک مانگنے والی۔

اشراف حسین احمد نے اپنے افسانوں میں پشتون معاشرت کی عکاسی کرتے ہوئے پشتو الفاظ نواتے (بدلے میں دی جانے والی لڑکی)، لختئی (ناچنے والا لڑکا) اور چم گوانڈ (ہمسائے)، گوانڈی (ہمسایہ)، پشکالی (برسات کے موسم کے گھاس)، پڑونے (عورت کی بڑی چادر) جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں اور اس کی خوبی وکمال یہ ہے کہ وہ پشتو اور دیگر زبانوں کے الفاظ کا اردو میں اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ یہ الفاظ خالص اردو زبان کا حصّہ معلوم ہوتے ہیں۔ایک جگہ پر’’پیرےئ ڈم‘‘ کا کردار پیش کرتے ہوئے لوگ جب پیرےئ ڈم کو دیوانہ سمجھ کر اس کا مذاق اڑانے کے لیے اس پر آوازیں کستے ہیں تو اس منظر کو کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے:

’’وہ ڈوم تو نہ تھا، پر گل سانگہ سے بیاہ کے بعد لوگ باگ اُسے ڈوم کہنے لگے تھے۔وہ

جب جوگی واڑہ کے کھوئے سے کھوا چھیلتے بسنتی بازار میں ڈگ بھرتا تو کبھی ایک طرف
سے ایک ساتھ بہت ساری آوازیں گونجتیں، پیرئے ڈم دے، تو کبھی دوسری طرف
سے بازار کے بھرے بتولے، نٹ کھٹ دکاندار ہانکتے، پیرئے ڈم دے۔'' **(۸۶)**

افسانہ ''اندھیرے کا گاؤ'' (۸۷) میں ''لختئے'' نام کا استعمال بھی ملتا ہے۔ لختئے پشتو میں ناچنے والے لڑکے کو کہا جاتا ہے۔ اسی افسانے میں پشتو ٹپے کے بول ''یا قربان'' (اے تیرے قربان جاؤں) کا ذکر بھی ملتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ رنگ نسل اور زبان نے اگر دنیا کو گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دیا ہے اور نفرت کی حد بندیاں کر دی ہیں تو یہ بھی بلاتردید کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے پاس لوک کہانیوں اور لوک گیتوں کی ایسی جادوئی عصا موجود ہے جس کے اشاروں سے انسان کو ایک سطح پر جمع کیا جاسکتا ہے اور اس کے سینے سے نفرت اور کدورت کے رنگ کو کھرچا جاسکتا ہے۔ پشتون معاشرے میں بھی لوک گیت گائے جاتے ہیں جبکہ مصرعے اور ٹپے بھی الاپے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس معاشرے میں لوک کہانیاں کہنے کا رواج بھی موجود ہے۔ لوک شاعری میں ٹپہ کو پشتون معاشرے میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان ٹپوں کے ذریعے پشتون ثقافت کے بہت سے پرتیں کھلتی ہیں۔ اردو کے پشتون افسانہ نگاروں نے اکثر افسانوں میں پشتو ٹپے کچھ اس مہارت سے شامل کیے ہیں کہ یہ ٹپے بعض اوقات پوری کہانی کی فضا بن جاتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ٹپے بذاتِ خود افسانوں کا جز بن گئے ہیں۔ فہمیدہ اختر نے اپنے افسانوں میں جابجا ٹپے استعمال کیے ہیں ''یہ بہار کا قصہ ہے'' میں پشتو ٹپے کا بہت موزوں جگہ پر استعمال کیا گیا ہے:

چہ ستاد مخ نخے پکے وی
زہ بہ ہمیش دھغے گل سلام کومہ **(۸۸)**

ترجمہ: (جس پھول میں تمہارے چہرے کے نشان ہوں گے میں ہمیشہ اُسے سلام
کروں گا)

ٹپہ پشتو شاعری کی مخصوص صنف اور پشتون ثقافت کا اہم عنصر ہے یہی وجہ ہے کہ پشتو لوک شاعری میں اسے ایک اہم صنف شمار کیا جاتا ہے۔ پشتون معاشرے میں عام طور پر کوئی شخص کھیتوں میں کام کرتا ہے تو ٹپے کے ذریعے اپنے جذبات کا انخلا اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دیتا ہے۔ ٹپے میں بڑا سوز اور دکھ پنہاں ہوتا ہے۔ افسانہ ''وطن اچھا کہ محبت'' میں عباس اور قمر وایک ساتھ کھیتوں پر کام کرنے جاتے ہیں۔ جب دو دل محبت کے مسرور جذبات سے لبریز ہوجاتے ہیں تو ایسے میں ٹپے گا گا کر ایک دوسرے کو دلی جذبات سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ اِس طرح ان کی محبت کا رشتہ مزید نکھر جاتا ہے اور ملن کی تڑپ مزید بڑھ جاتی ہے:

''میں نے رفتار اور تیز کر دی اور جب ٹیلے پر بیٹھے ہوئے کو پہچان لیا تو اونچی آواز میں

ٹپہ گانے لگا۔''(۸۹)

پشتونوں کے دیہاتی علاقوں میں جب دوشیزائیں پنگھٹ پر جاتی ہیں اور گھڑے بھر کر گھر لوٹتی ہیں تو راستے میں ستانے کے لیے بیٹھ جاتی ہیں اور ایک دوسرے سے ٹپہ گانے کی فرمائش کرتی ہیں۔یہی منظر افسانہ'' پنگھٹ پر'' میں بھی پیش کیا گیا ہے:

''تھوڑی دیر میں ساری لڑکیاں طاہرہ کے گرد آ بیٹھیں۔ان ستاروں کے جھرمٹ میں طاہرہ چاند کی طرح لگ رہی تھی۔وہ خالی گھڑا لے کر بجانے بیٹھ گئی۔اور گل اندام سے کہنے لگی۔تمہاری آواز تو بڑی میٹھی ہے۔ذرا ایک ٹپہ تو الاپو اور گل اندامے نے تان لگائی۔

''۔۔۔۔میں پنگھٹ پر جا رہی ہوں۔میرے پیچھے پیچھے آ ؤ۔۔۔۔۔''

''۔۔۔۔میری کمر پتلی ہے،۔۔۔۔۔''

''۔۔۔۔میں نے دو گھڑے اُٹھائے ہوئے ہیں،کہیں دوہری نہ ہو جائے۔۔۔۔۔''

شالو کو شرارت سوجھی۔اس نے کہا۔''خاطر جمع رکھو گل اندامے،تمہاری کمر یا گردن ٹوٹتی رہے۔پنگھٹ پر کوئی بھی تمہارے پیچھے نہیں آنے کا۔'' اور گل اندام بگڑ جاتی۔

''یہ اچھی بات نہیں شالو،خود ہی گانے کو کہتی ہو اور پھر خود ہی مذاق بھی اڑاتی ہو۔فکر نہ کرو تمہارے پیچھے گل دادا لالہ چھپے چوری ضرور آئے گا۔تاکہ سلیم خان نہ دیکھ لے۔'' اور اسی طرح دوشیزاؤں نے باری باری ٹپے گائے۔''(۹۰)

افسانہ'' پاگل''(۹۱) میں پشتون عورتیں کھیت کھلیانوں اور پنگھٹ پر پشتو لوک گیت،چار بیتہ،ٹپہ اور نیمہ کئی گاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔پشتون علاقوں میں جب کوئی شخص بھیڑ بکریاں چراتا ہے تو اکیلے میں وہ یا تو بانسری بجاتا ہے یا مصرعے اور ٹپے گاتا ہے۔افسانہ''بے اصولوں کے اصول'' میں جب پنجاب سے دو مہمان محسن اور سعیدہ قبائلی علاقے میں آتے ہیں تو گاؤں میں داخل ہوتے ہی اس کی ملاقات ایک گڈریے سے ہو جاتی ہے۔افسانہ نگار نے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے:

''ایک گڈریا چٹان پر بیٹھا اپنی ترنگ میں پشتو ٹپے گنگنا رہا تھا،دونوں قریب پہنچے تو گڈریے نے پلٹ کران کی طرف دیکھا،دونوں ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔گڈریا حیران،کہ یہ نوخیز کلیاں پہاڑوں میں کہاں سے پھوٹ پڑیں۔۔۔۔؟''(۹۲)

ضرب الامثال اور کہاوتیں کسی قوم کی مجموعی مزاج کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔افسانہ''نجب خان'' میں ایک بزرگ اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے اور انہیں بردباری کا درس دینے کے لیے ایک کہاوت دُہراتا ہے،جس سے پشتون قوم کی مہمان نواز فطرت کا عکس بھی جھلکتا ہے:

''ڈیرانئے! اونٹ رکھتے ہوتو دروازے بھی بڑے رکھو۔''(۹۳)

عام طور پر یہ کہاوت مہمان داری کی غرض سے نقل کی جاتی ہے۔لیکن مذکورہ افسانے میں اُس بزرگ نے اِسے صبرواستقامت، برداشت اور مقابلے کی صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے نقل کی ہے۔''کُتے مونڈنا'' پشتو ضرب المثل ہے جس کا مفہوم ہے کہ تنگ دست اور قلاش افراد اپنی بھوک مٹانے کی خاطر ذلیل سے ذلیل پیشہ اختیار کرنے پر بھی بعض اوقات کمربستہ ہوجاتے ہیں۔افسانہ''بے کفن''میں ایک بڈھا اپنی ابتر حالت کے اظہار کے لیے یہ ضرب المثل پیش کرتا ہے:

''میرے جیسے غریب تو روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر''کتے مونڈنے''پر مجبور ہو گئے تھے۔''(۹۴)

افسانہ''سورہ''میں بھی پشتون معاشرے کے ضرب الامثال کے ذریعے کہانی میں تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس افسانے میں قتل گل حسن کرتا ہے اوراس کی سزا مہ جبین کو مل جاتی ہے۔یعنی کرے کوئی، بھرے کوئی۔مصنف نے اس کیفیت کے لیے پشتو زبان کی یہ ضرب المثل نقل کی ہے:

''اوراب گدھے کی جگہ کمہار کوداغا جائے گا۔''اور بندر کی جگہ ریچھ دھر لیا جائے گا۔''(۹۵)

فیضی کا کا غریب لوہار ہے اور پائندہ خان کا باپ گاؤں کا ملک ہے لہٰذا دونوں میں برابری کہاں۔اس کیفیت کی وضاحت کے لیے بھی مصنف نے پشتو ضرب المثل نقل کی ہے:

''کہاں ہندو اور کہاں توت''(۹۶)

افسانہ''گونگا درد''میں جب امینہ اپنی بھابھی کے حوالے سے کہتی ہے کہ وہ کوئی غیر تو نہیں بلکہ اس کے بھائی کی منگیتر ہے،تو اس موقع پر اس کی امی کہتی ہے کہ نصیب کا کیا پتہ جب تک وہ اس گھر کی دہلیز پار کر کے دلہن بن کر نہیں آجاتی اس وقت تک وہ ایک غیر لڑکی ہے۔یہاں وہ پشتو کی مثل کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہتی ہے:

''باندے دیگونہ کوزشی چہ نصیب یے نہ وی شوے''(۹۷)

ترجمہ: (جب قسمت میں نہ ہو تو چھولے پر سے دیگیں بھی اُتر جاتی ہیں۔)

پشتو زبان میں ایسی بہت سی ضرب الامثال مشہور ہیں جس سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ پشتون معاشرے میں تقدیر پر بڑا یقین رکھا جاتا ہے۔پشتون معاشرہ پر قدر کی بجائے جبر کے عقیدے کا اثر زیادہ ہے۔افسانہ''مات کس کی؟''میں بھی پشتون بزرگوں کا ایک قول نقل کیا گیا ہے:

''تربورہ دیری بورہ۔''(۹۸)

تربور پشتو زبان میں عموزادکو کہاجاتا ہے لیکن پشتون معاشرے میں اکثر جنگ جھگڑے اورعداوتیں

عموزادوں کے درمیان ہوتی ہیں اس لیے تربور کا لفظ عام طور پر دشمن کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ ''تربورہ'' تربور کی تانیث ہے جو دشمن عورت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ افسانے میں چونکہ گل اندام، بشم خان کی بیوی ہونے کے علاوہ اس کی عموزاد بھی ہوتی ہے اس لیے وہ اس کو دشمن کہتا ہے۔

افسانہ ''برات'' میں بھی جب ظریف خان کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے تو اشرف خان اس کو دلاسا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس موقع پر وہ پشتون معاشرے میں مستعمل ضرب المثل نقل کرتا ہے:

''ماماوہی جگہ جلتی ہے جہاں آگ لگی ہو۔''**(۹۹)**

(یعنی تکلیف نقصان اُٹھانے والا ہی محسوس کرتا ہے۔)

اِس کے علاوہ جب ظریف کے بیٹے صنوبر کی جان بچانے کے لیے ڈاکٹر بہتیری کوشش کرتا ہے مگر وہ جان بر نہیں ہوتا اِس موقع پر بھی افسانہ نگار ایک ضرب المثل نقل کرتا ہے:

''ریت کے رسے کون بٹ سکتا ہے۔''**(۱۰۰)**

(یعنی جب قضا آتی ہے تو پھر تدبیر و استطاعت دونوں بے بس ہو کر رہ جاتی ہیں)

افسانہ ''شندی گل'' میں بھی جب لٹو اور افسانہ نگار ایک ہوٹل میں چائے پی لیتے ہیں تو لٹو کو نسوار کا شوق ستانے لگتا ہے:

''وہ اپنے پٹے ہوئے کُرتے کی جیب سے نسوار کی ڈبیا نکالتے ہوئے میرے سامنے کُرسی پر بیٹھ گیا۔

''آپ نسوار تو نہیں کرتے بابا صاحب۔''**(۱۰۱)**

یہاں نسوار کرنا بھی پشتو محاورہ ہے۔ چونکہ ہر زبان کے محاورے کا اپنا لگ مزاج ہوتا ہے اس لیے بعض اوقات دوسری زبان کا محاورہ ہو بہو ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے نسوار کرنے کا مطلب ہے کہ نسوار کی عادت ہے کہ نہیں۔ اسی طرح پشتو زبان میں مسوڑوں کے بیچ نسوار ٹھونسنے کے عمل کو نسوار لگانا کہا جاتا ہے لیکن اردو خواں نسوار کھانا کہتے ہیں۔

ان افسانوں میں پشتو ضرب الامثال، کہاوتوں اور محاوروں کے استعمال کے علاہ پشتونوں کی لوک کہانیوں کے کرداروں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ افسانہ ''نجب خان''**(۱۰۲)** میں ماتجو نجب خان کا ساتھی ہونے کے علاوہ اس کا مخبر بھی ہوتا ہے۔ جب وہ نجب خان کو یہ اطلاع دیتا ہے کہ انگریز سپاہی کل گاؤں میں گھسنے والے ہیں تو اُس وقت نجب خان ساتھیوں سمیت لال شیر ربابی سے آدم خان اور دُرخانئ کا قصّہ سُن رہا ہوتا ہے۔ آدم خان اور درخانئ کا قصہ پشتو لوک کہانیوں کا حصہ ہے۔ اس کہانی کو عوام میں اتنی مقبولیت مل چکی ہے کہ پشتون معاشرے کے ہر بچے کے کان اس سے آشنا ہیں۔

حسن کی چکاچوند سے متاثر ہونا اِنسانی فطرت ہے۔انسان جہاں بھی حسن کا نظارہ کرتا ہے۔اُسے اپنی فطری زبان میں سراہتا اور بیان کرتا ہے۔عام آدمی عام زبان میں حسن کے لیے تشبیہات واستعارات تلاشتا ہے اورفن کار،فن کارانہ سانچے تلاشتا ہے۔فاروق سرور افسانہ''ندی کی پیاس''میں ایک نانبائی کا کردارپیش کرتا ہے۔نانبائی کی محبوبہ کے حسن کا بیان جس انداز میں کرتا ہے وہ انداز،وہ تشبیہات واستعارات خالص پشتون کلچر میں رنگے ہوئے ہیں۔یہ تشبیہات واستعارات بعیداز قیاس نہیں بلکہ لوک کہانیوں کے جاندارکردار ہیں جوتمام پشتونوں کے سینوں میں زندہ ہیں:

> ''وہ حورشمائل سیف الملوک کی بدر جمال،آدم کی دُرخواورمومن خان کی شیرینو سے زیادہ حسین تھی۔''(۱۰۳)

افسانہ''بے اصولوں کے اصول''میں بھی پشتونوں کی روایتی کہانی ''بہرام اورگل اندام'' کا ذکرموجود ہے۔جب مرجانہ اپنی مہمان سعیدہ کا سنگھارکرتی ہے تو وہ بہت خوبصورت دکھائی دیتی ہے اس موقع پر جب سعیدہ اس سے کہتی ہے کہ وہ کیسی لگ رہی ہے تو مرجانہ کہتی ہے:

> ''بالکل شہزادی گل اندام،اگر میں لڑکا ہوتا تو بہرام بن کرتمہاری تلاش میں نکل پڑتا۔''(۱۰۴)

افسانہ''لوک گیت کا جنم''میں بھی رحیم گل اپنے گاؤں سے دورایک شخص کی ذہنی کیفیتوں کو بیان کرتا ہے۔یہ شخص اپنے گاؤں کی الھڑ دوشیزہ کے تصّور میں کھویا ہوا ہوتا ہے۔اس موقع پر وہ لوک کہانی گل اندام کے حوالے سے اپنی روایتی کہانیوں کا ذکر کچھ اس طرح کرتا ہے:

> ''جب میں خیالوں کی وادی میں کھو جاتا ہوں تو مجھے زمین کے ہر خطے اور ہر علاقے میں ایک گل اندام نظر آتی ہے۔کہیں سسی کے روپ میں،کہیں ہیر کے لباس میں،کہیں دُرخانئ کی شکل میں۔ میں دیکھتا ہوں۔تصّور کی آنکھ سے دیکھتا ہوں کہ پہاڑ کے سرسبز دامن میں بھیڑ بکریاں چر رہی ہیں۔کھلی وادی میں دوردور تک انسان کا سایہ نظر نہیں آتا۔سوائے ایک الھڑ دوشیزہ کے، جوایک چٹان پر بیٹھی پاؤں آہستہ آہستہ ہلا رہی ہے اور دھیرے دھیرے گنگنا رہی ہے۔اس کی نگاہیں دور مٹتی اور گم ہوتی پگڈنڈی پر لگی ہوئی ہیں اوراسے کسی ان دیکھے اوران جانے پردیسی کا انتظار ہے۔''(۱۰۵)

اس اقتباس میں جہاں پنوں کی سسی اور رانجھا کی ہیر کا ذکر کیا گیا ہے وہاں گل اندام اورآدم خان کی محبوبہ ''درخانئ'' کا ذکر بھی ملتا ہے۔ پشتونوں کی لوک کہانیوں میں جہاں یوسف خان شیر بانو یا یوسف کڑہ مار،شہی

ودلئی، شیر عالم میمونئ کی کہانیاں مقبول ہیں وہاں آدم خان درخانئ کی کہانی بھی اسی معاشرے میں قدیم دور سے قبولیت کا شرف حاصل کر چکی ہے اور آج بھی پشتونوں کے کان اس کہانی سے آشنا ہیں۔ افسانہ نگار جہاں آدم خان درخانئ کا ذکر کرتا ہے وہاں اپنے گاؤں کی ایک الھڑ دوشیزہ کا بھی ذکر کرتا ہے اسی دوشیزہ کا ذکر بھی رومانوی انداز میں کیا جاتا ہے اور پشتون معاشرے کی پہاڑی علاقے کی رومانوی خوبصورتی کا خوبصورت انداز میں عکاسی کرتا ہے۔

اردو بڑی وسیع اور دلکش زبان ہے اور اس زبان کی یہ خوبی ہے کہ وہ اپنے لشکری مزاج میں علاقائی زبانوں کے الفاظ کو بڑی خوبصورتی سے سمو لیتی ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے جہاں پشتونوں کی مقامی معاشرت کی عکاسی کی ہے وہاں اکثر مواقع پر ان کی زبان بھی مقامی اثر لے کر آگے بڑھی ہے جو کہ دامن اردو کی وسعت میں اپنی طرف سے سعی کرنے کے مترادف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان افسانوں کے ذریعے اردو زبان وادب کو نئے موضوعات اور نئے اسالیب ملے۔

حوالہ جات

۱۔ طاہر آفریدی، ’’برف پہاڑوں کا آدمی‘‘، مشمولہ: ’دیدن‘، بختیار اکیڈمی، کراچی، دسمبر ۱۹۸۲، ص ۱۹

۲۔ سحر یوسفزئی، ’’اندھیرے کا بیٹا‘‘، مشمولہ: ’’آگ اور سائے‘‘، بار اوّل، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۱۴۵

۳۔ بانو قدسیہ، ’’موم کا پُتلا، دست بستہ‘‘، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۴۵

۴۔ محمد خالد اختر، ’’کاریز‘‘، مجموعہ محمد خالد اختر، جلد سوم: افسانے، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، س ن، ص ۹۸

۵۔ طاہر آفریدی، ’’بہانہ‘‘، مشمولہ: دیدن، ص ۱۳۰

۶۔ طاہر آفریدی، ’’پنشن‘‘، مشمولہ: دیدن، ص ۹۳

۷۔ طاہر آفریدی، ’’وہ جو گاؤں تھا‘‘، مشمولہ: دیدن، ص ۸۱۰۵۔

۸۔ سید انوار الحق، ’’حوالدار فقیر خان‘‘، مشمولہ: ’’پشتو افسانے‘‘، مترجم: رضا ہمدانی، گوشۂ ادب، لاہور، سن ندارد، ص ۱۵۹

۹۔ اشراف حسین احمد، ’’نانی مریم‘‘، مشمولہ: آکاس بیلیں، احمد سلمان پبلی کیشنز، پشاور، اپریل ۱۹۹۱ء، ص ۳۹

۱۰۔ اشراف حسین احمد، ’’پیرے ڈم‘‘، مشمولہ: آکاس بیلیں، اپریل ۱۹۹۱ء، ص ۵۴۔۵۵

۱۱۔ فاروق سرور، ’’جالے‘‘، مشمولہ: ندی کی پیاس، بار اول، تھرڈ ورلڈ پبلی کیشنز، کوئٹہ، ۱۹۹۶ء، ص ۶۴

۱۲۔ فاروق سرور، ’’بونا‘‘، مشمولہ: ندی کی پیاس، ص ۴۳

۱۳۔ مراد شنواری، ’’نجب خان‘‘، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی، ص ۲۸

۱۴۔ طاہر آفریدی، ’’ٹھنڈک‘‘، مشمولہ: دیدن، ص ۱۲۵

۱۵۔ فاروق سرور، ’’چار گل‘‘، مشمولہ: ندی کی پیاس، ص ۴۵

۱۶۔ فاروق سرور، ’’دف‘‘، مشمولہ: ندی کی پیاس، ص ۳۲

۱۷۔ فاروق سرور، ’’پیاسے خواب‘‘، مشمولہ: ندی کی پیاس، ص ۱۷

۱۸۔ شمیم فضل خالق، ''پیاسے خواب''، مشمولہ: بدلتے موسموں کے رنگ، ص۵۲۲
۱۹۔ فاروق سرور، ''دف''، مشمولہ: ندی کی پیاس، ص۳۲
۲۰۔ فاروق سرور، ''مجرم''، مشمولہ: ندی کی پیاس، ص۵۹
۲۱۔ رحیم گل، ''بے اُصولوں کے اصول''، مشمولہ: سرحدی عقاب، باراوّل، لاہور، رابعہ بک ہاؤس، ۲۰۰۰ء، ص۱۲۵
۲۲۔ رحیم گل، ''توکلی مست''، مشمولہ: سرحدی عقاب، ص۷۵
۲۳۔ رضا ہمدانی، ''غوبل''، مشمولہ: اٹک کے اس پار، ص۲۸۸
۲۴۔ رضا ہمدانی، ''غوبل''، مشمولہ: اٹک کے اس پار، ص۲۹۴
۲۵۔ کنہیالال کپور، ''موسیٰ خان''، مشمولہ: اٹک کے اس پار، ص۲۷۸
۲۶۔ کنہیالال کپور، ''موسیٰ خان''، مشمولہ: اٹک کے اس پار، ص۲۷۹
۲۷۔ ایضاً، ص۲۸۱
۲۸۔ رابندر ناتھ ٹیگور، ''کابلی والا''، رابندر ناتھ ٹیگور کے انمول افسانے، عبداللہ اکیڈمی، لاہور، ۲۰۱۰ء ص۲۵۴
۲۹۔ ایضاً، ص۲۵۷
۳۰۔ ایضاً، ص۲۵۹
۳۱۔ قیوم مروت، ''اللہ بچائیو!''، مشمولہ: وہ میں بھی ہوں وہ تم بھی ہو، گلشن ادب پبلی کیشنز، لاہور، اپریل ۲۰۰۸ء، ص۴۶
۳۲۔ ایضاً، ص۵۵
۳۳۔ ایضاً، ص۵۵
۳۴۔ ایضاً، ص۶۱
۳۵۔ رحیم گل، ''خاموش نگاہیں''، مشمولہ: سرحدی عقاب، باراوّل، رابعہ بک ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۱۶۲
۳۶۔ شمیم فضل خالق، ''پیاسے خواب''، مشمولہ: بدلتے موسموں کے رنگ، ملت ایجوکیشنل پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۵۰۶
۳۷۔ ایضاً، ص۵۱۱
۳۸۔ ایضاً، ص۵۱۵
۳۹۔ قیوم مروت، ''اللہ بچائیو!''، مشمولہ: وہ میں بھی ہوں وہ تم بھی ہو، ص۵۶
۴۰۔ ایضاً، ص۵۶
۴۱۔ ایضاً، ص۵۶
۴۲۔ ایضاً، ص۵۷
۴۳۔ مراد شنواری، ''بے کفن''، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی، ص۴۵
۴۴۔ طاہر آفریدی، ''بیری کا درخت''، مشمولہ: دیدن، ص۶۳
۴۵۔ طاہر آفریدی، ''کھلا صندوق''، مشمولہ: دیدن، ص۴۳

۴۶۔ عبدالکافی ادیب، ''شعلہ خو''، مشمولہ: بگڑے چہرے، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، ۱۹۶۲ء، ص ۱۸

۴۷۔ زیتون بانو، ''ناتمام آرزو''، مشمولہ: زندہ دکھ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۷۶

۴۸۔ طاہر آفریدی، ''آنکھیں راستے''، مشمولہ: دیدن، ص ۱۱۶

۴۹۔ طاہر آفریدی، ''آنکھیں راستے''، مشمولہ: دیدن، ص ۱۱۹

۵۰۔ قلندر مومند، ''سہارے''، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی، ص ۷۱

۵۱۔ طاہر آفریدی، ''کھلا صندوق''، مشمولہ: دیدن، ص ۴۳

۵۲۔ شمیم فضل خالق، ''عطایا سزا''، مشمولہ: بدلتے موسموں کے رنگ، ص ۲۹۱

۵۳۔ محمد خالد اختر، ''کاریز''، مجموعہ محمد خالد اختر، جلد سوم: افسانے، ص ۹۸

۵۴۔ رضا ہمدانی، ''غوبل''، مشمولہ: اٹک کے اس پار، ص ۲۸۶

۵۵۔ ایضاً، ص ۲۸۷

۵۶۔ سحر یوسفزئی، ''زیتون اور نرگس''، مشمولہ: آگ اور سائے، بار اوّل، مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۳۹

۵۷۔ زیتون بانو، ''بیٹی کا بوجھ''، مشمولہ: زندہ دکھ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۲

۵۸۔ زیتون بانو، ''فصیلیں''، مشمولہ: زندہ دکھ، ص ۱۹۴

۵۹۔ در محمد کاسی، ''آخری ملاقات''، مشمولہ: پشتو زبان کے بہترین افسانے، مترجم: علی کمیل قزلباش، کلاسیک پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۶

۶۰۔ طاہر آفریدی، ''دعائے مغفرت''، مشمولہ: دیدن، ص ۱۳۵

۶۱۔ شمیم فضل خالق، ''الٹا وار''، مشمولہ: بدلتے موسموں کے رنگ، ص ۹۶

۶۲۔ طاہر آفریدی، ''کھلا صندوق''، مشمولہ: دیدن، ص ۴۳

۶۳۔ سحر یوسفزئی، ''خشک چٹانیں''، مشمولہ: آگ اور سائے، بار اوّل، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۶۰

۶۴۔ رضا ہمدانی، ''غوبل''، مشمولہ: اٹک کے اس پار، گوشۂ ادب، لاہور، س ن، ص ۲۸۹

۶۵۔ سحر یوسفزئی، ''سائے''، مشمولہ: آگ اور سائے، ص ۲۶

۶۶۔ سرور افزا نگار، ''پنگھٹ پر''، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی، ص ۱۱۱

۶۷۔ قلندر مومند، ''سہارے''، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی، ص ۷۱

۶۸۔ سحر یوسفزئی، ''اندھیرے کا بیٹا''، مشمولہ: آگ اور سائے، ص ۱۴۵

۶۹۔ فہمیدہ اختر، ''یہ بہار کا قصہ ہے''، مشمولہ: کشمالہ، ص ۹

۷۰۔ طاہر آفریدی، ''بیری کا درخت''، مشمولہ: دیدن، ص ۶۳

۷۱۔ اشراف حسین احمد، ''اعتراف''، مشمولہ: آکاس بیلیں، احمد سلمان پبلی کیشنز، پشاور، اپریل ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۳

۷۲۔ حیات اللہ کاکڑ، ''اشر''، مشمولہ: صرف شرفا کے لیے، مرتب، قیوم مروت، گلشن ادب پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۵۰

۷۳۔زیتون بانو، ''دوشیزگی کی نشانی''، مشمولہ: زندہ دکھ، مقبول اکیڈمی، لاہور،۱۹۹۸ء، ص ۶۶
۷۴۔اشفاق احمد، ''بدنی ضرورت''، مشمولہ: طلسم ہوش افزا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۳ء، ص ۱۰۶
۷۵۔منوررؤف، ''دروند پختون''، مشمولہ: طرفہ تماشا،طبع اوّل، عظیم پبلشنگ ہاؤس، پشاور، جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۷
۷۶۔ طاہر آفریدی، ''متاعِ جاں''، مشمولہ: دیدن، ص ۴۷
۷۷۔امیر ساغر آفریدی، ''برات''، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی، ص ۱۴۱
۷۸۔فاروق سرور، ''دف''، مشمولہ: ندی کی پیاس، باراول، تھرڈ ورلڈ پبلی کیشنز، کوئٹہ، ۱۹۹۶ء، ص ۳۵
۷۹۔ طاہر آفریدی، ''گردِ سحر''، مشمولہ: دیدن، ص ۷۹
۸۰۔ طاہر آفریدی، ''پگڑی''، مشمولہ: دیدن، ص ۹۹
۸۱۔ طاہر آفریدی، ''ٹھنڈک''، مشمولہ: دیدن، ص ۱۲۱
۸۲۔ فاروق سرور، ''دف''، مشمولہ: ندی کی پیاس، ص ۳۳
۸۳۔وحیدہ فرحت، ''بے اعتبار''، مشمولہ: گونگا کلچر، اشاعت اوّل، م ن، پ ن، ۱۹۹۷ء، ص ۳۹
۸۴۔زیتون بانو، ''کانچ کے ٹکڑے''، مشمولہ: زندہ دکھ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۹۲
۸۵۔ زیتون بانو، ''صوا لئے''، مشمولہ: زندہ دکھ، ص ۳۰۸
۸۶۔ اشراف حسین احمد، ''پیرئے ڈم''، مشمولہ: آ کاس بیلیں، ص ۶۲
۸۷۔طاہر آفریدی، ''اندھیرے کا گھاؤ''، مشمولہ: دیدن، ص ۸۹
۸۸۔فہمیدہ اختر، ''یہ بہار کا قصہ ہے''، مشمولہ: کشمالہ، باراول، یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور، ۱۹۶۱ء، ص ۹
۸۹۔ نادر خان بزمی، ''وطن اچھا کہ محبت''، مترجم: رضا ہمدانی، گوشۂ ادب، لاہور سن ندارد، ص ۲۰۱
۹۰۔ سرور افزا نگار، ''پنگھٹ پر''، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی، گوشۂ ادب، لاہور، سن ندارد، ص: ۱۱۲
۹۱۔ اشراف حسین احمد، ''پاگل''، مشمولہ: آ کاس بیلیں، ص ۱۱۵
۹۲۔ رحیم گل، ''بے اُصولوں کے اصول''، مشمولہ: سرحدی عقاب، باراوّل، رابعہ بک ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۴
۹۳۔ مراد شنواری، ''نجب خان''، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی ص ۳۳
۹۴۔ مراد شنواری، ''بے کفن''، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی، ص ۴۴
۹۵۔ سید منیر بادشاہ بخاری، ''سورہ''، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی، ص ۱۷۱
۹۶۔ سید منیر بادشاہ بخاری، ''سورہ''، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی، ص ۱۷۱
۱۰۲۔مراد شنواری، ''نجب خان''، مشمولہ: پشتو افسانے، مترجم: رضا ہمدانی، ص ۲۴
۱۰۳۔فاروق سرور، ندی کی پیاس، مشمولہ: ندی کی پیاس، باراول، تھرڈ ورلڈ پبلی کیشنز، کوئٹہ، ۱۹۹۶ء، ص ۱۹
۱۰۴۔رحیم گل، ''بے اصولوں کے اصول''، مشمولہ: سرحدی عقاب، باراوّل، رابعہ بک ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۵
۱۰۵۔رحیم گل، ''لوک گیت کا جنم''، مشمولہ: سرحدی عقاب، ص ۱۵۸